چاہیے کہ یہاں جلد از جلد اسلامی نظام کا نفاذ ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی قانون کو اگر پوری نیک نیتی سے نافذ کر دیا جائے تو وہ اسی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہو گا کہ عوام کے قلوب و اذہان اس کے لیے آمادہ ہوں۔ تقسیم ملک کے وقت تو پوری قوم اس معاملے میں یکسو تھی اور اسلامی نظامِ حیات کو اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھتے ہوئے اُس کی بازیابی کے لیے اپنے اندر گہری آرزو اور تڑپ رکھتی تھی مگر گذشتہ ۲۳ سالوں میں تخریب پسند قوتوں کو کھُل کھیلنے کے جو مواقع میسر آئے ہیں انھوں نے اس یکسوئی کو کافی صدمہ پہنچایا ہے اور اب قوم کے اندر متعدد ایسے عناصر بھی اُبھر آئے ہیں جو خود بھی ذہنی انتشار کا شکار ہیں اور قوم کو بھی اس انتشار میں مبتلا کرنے کے لیے ہر وقت تگ و دو کرتے رہتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کی تخریبی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے کہ تقسیم ملک کے وقت قوم جس معاملے میں پوری طرح متفق اور متحد تھی اس کے بارے میں آج ذہنوں میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً نوجوان نسلوں کے اندر تو اس کے تباہ کُن اثرات اتنے نمایاں ہیں کہ انھیں ہر شخص جو معمولی سی بصیرت بھی رکھتا ہے بآسانی دیکھ سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ نوجوانوں کے ذہنوں میں پھر سے ایمان کی شمع فروزاں کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ حکومت اس سلسلے میں جلد از جلد جو کچھ کر سکتی ہے اس میں سرِفہرست اقدام یہ ہونا چاہیے کہ ملک کی ساری زبانوں اور بالخصوص بنگلہ زبان کے اندر دینی لٹریچر کی اشاعت وسیع پیمانے پر کی جائے اور اس غرض کے لیے نہایت سلیقے کے ساتھ ہمہ گیر منصوبہ بنایا جائے۔

جن گوناگوں عناصر نے ملک کے اندر ذہنی انتشار اور افتراق کے بیج بوئے ہیں ان میں ایک مؤثر عنصر الحاد پسند ادیبوں اور شاعروں کا ہے۔ آپ اگر اُن انتشار پسندوں کی سرگرمیوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ انھوں نے ادب کی وساطت سے نوخیز نسلوں کے ذہنوں کے اندر زہر بھرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو زبان میں ترقی پسند ادب کے نام پر جو تخلیقات کی گئی ہیں وہ اسلام سے انحراف اور روحانی و معاشرتی و اخلاقی اقدار کے خلاف بغاوت کی نہایت واضح طور پر عکاسی کرتی ہیں۔ عوام کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن درحقیقت اس نئے ادب میں الحاد اور زندقہ کا پرچار کیا جاتا ہے۔ دینِ حق کے ایک ایک اصول کے خلاف ذہنوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے بوئے جاتے ہیں۔ یہ اس ملک کی خوش قسمتی ہے کہ ادب کے ان بزرجمہروں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہو سکا جسے ڈاکٹر اقبال، علامہ شبلی، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکے۔ ان بلند ہستیوں کے سامنے یہ سب باونے نظر آتے ہیں اور "ستائش باہمی" کی جو انجمنیں اور اجارہ داریاں انھوں نے قائم کر رکھی ہیں اُن کی خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے باوجود وہ کوئی ایک شخصیت بھی ایسی اُبھار کر

سامنے نہیں لاسکے جس سے ملت کے ان حقیقی محسنوں کی حیثیت کسی اعتبار سے ماند پڑتی ہو۔ یہ محسن آج بھی زبان و ادب پر پوری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ چونکہ ان میں سے ہر شخص کے ادب کا سرچشمہ اسلام تھا۔ اس لیے ان کے تخلیق کردہ ادب کی اشاعت سے اسلامی اقدار، اسلامی نظریۂ حیات، اسلامی روایات اور اسلامی احساسات کو تقویت حاصل ہوتی رہتی ہے۔

اردو زبان کو تو واقعی یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ہمارے بزرگوں نے ادب کی جو مختلف قندیلیں فروزاں کی ہیں ان کی روشنی پوری فضا پر محیط ہے اس لیے جس سمت بھی کوئی سُرخی یا سیاہی نمودار ہوتی ہے لوگ فوراً اسے بھانپ لیتے ہیں، مگر یہ شرف پاکستان کی دوسری زبانوں کو حاصل نہیں بنگلہ ادب میں بلاشبہ بعض ایسے جواہر پارے بھی ملتے ہیں جن میں اسلامی احساسات کی چمک موجود ہے مگر اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنگلہ ادب میں کوئی اقبال نہیں پایا جاتا جس کے حیات آفریں افکار و نظریات اور ساحرانہ اسلوب بیان نے نوجوان نسل کے قلب و دماغ پر نہایت گہرے دینی اثرات مترتب کیے ہوں۔

بنگلہ ادب پر اسلامی تصورات کے بجائے غیر اسلامی تصورات کی گہری چھاپ موجود ہے کیونکہ اس ادب کی تخلیق میں زیادہ حصہ ٹیگور اور اس کے متبعین کا ہے [illegible]ن ادب کی تہ میں اسلامی روایات کی تابناکی کے بجائے ہندوانہ اساطیر و رسومات کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں بنگلہ زبان و ادب کے محاورے، استعارے اور تشبیہات اور تلمیحات بلکہ اس کے پورے صوتی نظام میں ہندوانہ طرز فکر اور معاشرت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

میری ان گزارشات کا مقصد یہ نہیں کہ اس زبان و ادب میں اسلامی افکار کی ترجمانی بالکل ناپید ہے۔ یہ سرزمین جن مقدس صوفیاء کی کوششوں کی وجہ سے اسلام کی ضیا پاشیوں سے منور ہوئی ہے اُس میں ایسے لوگ کافی تعداد میں پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے بنگلہ ادب میں اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کے نہایت واضح نقوش چھوڑے ہیں مگر وہ نقوش غیر اسلامی رجحانات کی غیر معمولی قوت کی وجہ سے کافی حد تک ماند پڑ گئے ہیں نیز اُردو ادب میں اسلامی اثرات جتنے ہمہ گیر اور گہرے ہیں وہ گہرائی اور گیرائی ہمیں بنگلہ ادب میں نہیں ملتی۔ اردو ادب میں اگر آپ اسلام کے روحانی اور اخلاقی نظام کے بارے میں ٹھوس معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو اس میدان میں آپ کو اچھا خاصا لٹریچر مل جائے گا۔ اگر آپ اسلام کے اجتماعی نظام کو سمجھنے کے آرزومند ہیں تو اس کے لیے بھی آپ کو نہایت اچھی کتب فراہم ہو جائیں گی۔ الغرض اسلامی نظام کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کی وضاحت کے لیے اردو زبان

میں نہایت عمدہ معیاری کتب نہ لکھی گئی ہوں اور ان میں سے بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ اُن کی نظیر دوسری زبانوں میں تو کیا خود عربی زبان میں نہیں مل سکتی ہم یہ بات کسی فخر و مباہات کے جذبے سے نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر کہتے ہیں کہ مولانا مودودی کے قلم سے اسلام کے اجتماعی نظام پر بعض ایسی بلند پایہ تصانیف مرتب ہوتی ہیں جو وسعتِ معلومات، ترتیب مواد، حکیمانہ طرز استدلال اور دلکش اسلوبِ نگارش کی بنا پر پورے اسلامی ادب میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں بنگلہ ادب اس معاملے میں اردو کے مقابلے میں کافی حد تک تہی دامن ہے اس میں اسلامی تعلیمات کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ زیادہ تر صوفیا کے افکار و تصورات پر مشتمل ہے اسلامی سیاست، اسلامی معاشرت، اسلامی معیشت، اسلامی نظامِ تعلیم، اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ اور قانون الغرض اسلام کے نظامِ اجتماعی کے بارے میں بنگلہ ادب نے ابھی تک کوئی ایسا قابلِ قدر سرمایہ فراہم نہیں کیا جو نوجوان نسلوں کو ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال کر سکے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تخریب پسند عناصر لسانی تعصبات کو ہوا دے کر بڑی آسانی کے ساتھ مذموم کارروائیاں کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مغربی اور مشرقی پاکستان میں بُعد و بیگانگی جس نے بالآخر شدید عداوت کی صورت اختیار کر لی تھی، پہلی علامت لسانی جھگڑے کی شکل میں ظاہر ہوئی اور پھر اس جھگڑے ہی نے آہستہ آہستہ اختلافات کی خلیج کو یہاں تک وسیع کر دیا کہ ملک تباہی کے دہانے تک جا پہنچا۔ اب ہمیں اس کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ موجودہ حالات میں یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی ایک ایسی زبان تخلیق کر لی جائے جو ملک کے تمام عناصر کو متحد کر سکے۔ یا رومن رسم الخط کو اختیار کر کے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ اخوت میں منسلک کیا جا سکے۔ زبان کی تخلیق کسی سائنسی ایجاد کی طرح یکایک نہیں کی جا سکتی۔ زبان ایک ایسے فطری اور ارتقائی عمل کے نتیجے میں معرض وجود میں آتی ہے جس میں انسان کی منصوبہ بندی کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اسے مختلف مراحل سے گزرنے میں سینکڑوں سال لگ جاتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے جغرافیائی حالات میں جو وسیع اختلافات موجود ہیں انہیں سامنے رکھتے ہوئے لسانی وحدت کا خیال مجذوب کے خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جو لوگ رومن رسم الخط کو اختیار کر کے ملی اتحاد کے حصول کی راہیں ہموار کرنے کی تجاویز پیش کرتے ہیں وہ یا تو فاتر العقل ہیں یا اس ملت اور اس کے مزاج سے یکسر ناآشنا ہیں۔ رسم الخط کی تبدیلی سے نہ صرف مزید افتراق اور انتشار پیدا ہو گا بلکہ ایک خطے کے رہنے والے بھی خود اس خطے میں اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔ اس کے علاوہ پوری ملت کا اپنے ماضی سے رشتہ منقطع ہو جائیگا

اور یہاں کے مسلمان کی حالت اس دیوانے کی سی ہوگی جو کسی صدمے یا ضرب کاری کی وجہ سے اپنے ماضی کو یکسر بھول کر بچوں کی سی مجنونانہ حرکات کرنے لگتا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ترنگ میں آکر کسی خاص رسم الخط کو اختیار نہیں کرتی بلکہ اپنے اجتماعی ضمیر اور ملی روح کے اظہار کے لیے تہذیب و تمدن کے جو مختلف پیکر تیار کرتی ہے اُن میں سب سے زیادہ حسین و جمیل پیکر رسم الخط ہوتا ہے۔ اس پیکر کا کسی قوم کے مزاج اور اُس کے اساسی فکر سے اتنا ہی گہرا تعلق ہے جتنا کہ جسم اور روح یا لفظ کی ظاہری ہیئت اور اس کے معانی کا ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی سے قوم کا مزاج اور اُس کی روح بدل جاتی ہے چنانچہ جو لوگ حکومت کو اس قسم کے غلط مشورے دیتے رہتے ہیں وہ اس ملّت کے کسی طرح بھی خیرخواہ نہیں ہو سکتے۔

موجودہ حالات میں عملی طور پر جو چیز ممکن ہے وہ یہ ہے کہ بنگلہ ادب کو اسلامی افکار و نظریات اور اسلامی تعلیمات سے مالامال کیا جائے۔ قرآن، حدیث، فقہ اور اسلام کے اجتماعی نظام کے مختلف گوشوں پر اس قدر فکر انگیز اور دلکش لٹریچر فراہم کیا جائے کہ نوجوان نسل کے اندر ایک عظیم انقلاب پیدا ہو جائے۔ اُردو زبان میں اسلام کے مختلف گوشوں پر جو لٹریچر تیار ہو چکا ہے اُسے بنگلہ میں منتقل کیا جائے نیز شاعر اپنی شعری تخلیقات کے ذریعے نثر نگار اپنی نثر کے ذریعے، افسانہ نگار اپنے افسانوں کے ذریعے اور اہلِ علم اپنے علمی مضامین کے ذریعے بنگلہ زبان کو ایسا بیش قیمت مواد فراہم کر دیں جس سے اس زبان کے بولنے والوں میں دینی احساسات و جذبات بیدار ہوں اور وہ دینی رشتوں کو لسانی، نسلی اور جغرافیائی رشتوں پر ہر لحاظ سے مقدم سمجھنے لگیں۔ جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے نئی تخلیقات پیش کرنے کی توفیق دی ہے انہیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بنگلہ زبان کے دامن کو اسلام سے بھر دینا چاہیے اور جو لوگ ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں انہیں مختلف اسلامی کتب کو اعلیٰ معیار کے مطابق بنگلہ میں منتقل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اس میں اسلامی رنگ نمایاں نظر آنے لگے اور نوجوان نسل خود بخود اس رنگ میں رنگ جائے۔

یہ انقلاب صرف بنگلہ زبان و ادب تک ہی محدود نہ رہنا چاہیے۔ پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں اسی نوعیت کا کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس ملک کے تخریب پسند عناصر نے مقامی بولیوں کے ذریعے پاکستان کی نظریاتی اساس پر اتنا خوفناک شبخون مارا ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جب ان لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اُردو زبان و ادب کے دائرے میں اسلامی اثرات کو زائل نہیں کر سکتے تو انہوں نے علاقائی زبانوں کے ذریعے ملّت کی بربادی کے نقشے تیار کیے۔ اس مذموم کام کا آغاز اس معصوم دعوے کے ساتھ کیا گیا کہ علاقائی زبانوں کو بھی ترقی کے مواقع

ملنے چاہییں۔ یہ دعویٰ بظاہر بڑا سادہ اور بے ضرر سا ہے۔ دنیا کا کون بیوقوف ہے جو کسی خاص علاقے کی زبان کے ساتھ معاندانہ برتاؤ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ چنانچہ اس دعوے کے ساتھ ہی پھر یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ جب تک ان زبانوں کو سرکاری سرپرستی اور اعانت حاصل نہ ہو، یہ خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتیں۔ یہ تجویز بھی بظاہر معقول تھی۔ سرکار نے اسے شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے بڑی دریا دلی کے ساتھ ان علاقائی زبانوں کی ترقی کے لیے مختلف انجمنوں اور اداروں کو بڑی بڑی رقمیں دینی شروع کیں۔ مگر عملاً ہوا یہ کہ وہ سارا ادیب اور شاعر جو اُردو زبان و ادب کے دائرے پر اسلام کے خلاف کوئی مؤثر کام کرنے میں سخت ناکام ہوئے انہوں نے ان علاقائی زبانوں کی انجمنوں اور اداروں میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ ان پر قابض ہو کر اپنے ہم خیالوں کو ان میں شامل کر لیا اور پھر اس علاقائی ثقافت کی خدمت کی آڑ لیکر قوم کی تباہی کے منصوبے تیار کیے جانے لگے۔ ان لوگوں نے پہلے مرحلے پر ان زبانوں کی بعض ایسی معروف کلاسیکی تصنیفات کی اشاعت کا بندوبست کیا جن سے کسی نہ کسی طرح ان کے نظریات کی تائید کے پہلو نکلتے ہوں یا نکالے جا سکتے ہوں۔ ہمارے اس ملک کی علاقائی زبانوں میں جو ادب ملتا ہے وہ زیادہ تر یا تو صوفیانہ خیالات سے عبارت ہے یا حسن و عشق کی ایسی داستانوں پر مشتمل ہے جن سے گذشتہ چند صدیوں کے دیہاتی معاشرے کے خدو خال نمایاں ہوتے ہیں۔ اس نوعیت کے ادب کی اشاعت اس ملک کے بے دین طبقے کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ یہ لوگ صوفیانہ خیالات کی اس لیے پذیرائی نہیں کرتے کہ انہیں فی الحقیقت ان سے کوئی دلچسپی ہے بلکہ وہ ان سے محض اس لیے اپنا تعلقِ خاطر ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ ان خیالات کی آڑ میں اسلامی نظامِ شریعت کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر سکتے ہیں۔ چند صوفی شعراء کے کلام کی تدوین و اشاعت کے علاوہ یہ تخریب پسند عناصر اپنے سارے وسائل پاکستان کی نظریاتی اساس کو تباہ کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ یہ لوگ علاقائی بولیوں کو کمیں گاہوں کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جہاں یہ حکومت کی حفاظت اور سرپرستی اور حکومت کے فراہم کردہ ذرائع کی مدد سے پاکستان کی بنیادوں کو منہدم کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ ان لوگوں کی مذموم کارروائیوں کا نتیجہ ہے کہ صوبائی تعصبات جنگل کی آگ کی طرح بڑی سُرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں۔ چنانچہ سندھی زبان میں جی ایم سید، شیخ ایاز اور اُس کے ساتھیوں نے اسلام کے خلاف جو زہر پھیلایا ہے اُس سے کون ناواقف ہے۔ یہ اُس زہریلے پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ محمد بن قاسم جیسے مردِ مجاہد کے مقابلے میں راجہ داہر کو ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور مسلم مجاہدین کے بارے میں عوام کے اندر یہ تاثر

پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ لوگ ظالم اور ستمگر تھے اور انہوں نے محض جوع الارض کے تحت سندھ کی زمین کو تاخت و تاراج کیا۔ اسلامی تعلیمات کو تصوف کے نام پر جس بُری طرح مسخ کیا گیا ہے وہ اس قدر شرمناک ہے کہ اُسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بلوچی اور پشتو میں بھی اس قسم کے زہریلے خیالات بڑی چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ داخل کیے جا رہے ہیں۔ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمان جو کبھی اپنے آپ کو وسیع مسلم برادری کے ارکان خیال کیا کرتے تھے اب پنجابی، بنگالی، پختون، سندھی اور بلوچی کے انداز پر سوچنے لگے ہیں اور علاقائی تعصبات میں اس خدنگ ڈوب گئے ہیں کہ انہیں ملکی اور ملّی مفادات قطعاً نظر نہیں آتے۔ اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہے کہ یہ ملک جو اسلام کے تصورِ قومیت کی زندہ شہادت کے طور پر معرضِ وجود میں آیا تھا اب چھوٹی قومیتوں کی رزمگاہ بن کر رہ گیا ہے۔

اگر اس ملک کے بہی خواہ فی الحقیقت یہاں کوئی حیات آفریں انقلاب لانا چاہتے ہیں اور اس ملک کے مختلف طبقوں میں وحدت پیدا کر کے اسے ایک نظریاتی مملکت بنانے کے آرزومند ہیں تو انہیں سب سے پہلے اس ملک کی نظریاتی اساس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اس بات کے لیے ضروری ہے کہ سب سے زیادہ اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ کوئی فرد یا گروہ علاقائی تعصبات نہ اُبھار سکے۔ اس سلسلے میں سب سے اوّل مرحلہ یہ ہے کہ علاقائی بولیوں کی محبت کی آڑ میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اُسے ختم کیا جائے اور ان علاقائی بولیوں کو اسلام کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بنایا جائے۔ آخر یہ کیونکر فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ بولیاں صرف کفر و الحاد اور اخلاقی بے راہ روی اور انارکی کی تعلیم ہی دیتی ہیں۔ علاقائی زبانوں کی خدمت ایک قابلِ قدر کام ہے مگر اس خدمت کے پردے میں ملک کے اندر افتراق پیدا کرنے کے منصوبے ہر لحاظ سے قابلِ نفرت ہیں، اور ان کی پوری قوت سے حوصلہ شکنی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ حالات اس بات کے شدت سے متقاضی ہیں کہ ان زبانوں پر تخریب پسند عناصر نے جو اجارہ داریاں قائم کر رکھی ہیں انہیں توڑا جائے تاکہ مسلم قوم کے دیتے ہوئے ٹیکسوں سے یہ لوگ اس ملت کے خلاف سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکیں۔ اگر ان میں کوئی دم خم ہے اور انہیں ان بولیوں سے عشق ہے تو پھر یہ لوگ کھلے بندوں اپنے وسائل سے کام کریں اور عوام کو بھی معلوم ہو جائے کہ ان کے کیا ارادے ہیں۔ سرکاری سرپرستی اور اعانت سے چلنے والے ادارے عام طور پر عوامی احتساب کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں

افواجِ پاکستان کی کارروائی کے خلاف پروپگنڈے کا جواب

مولانا مودودی کا میمورنڈم دنیائے اسلام کے نام

[جب سے پاکستان کی فوج نے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند عناصر اور ہندوستانی دخل اندازوں کی تخریبی کارروائیوں کو کچلنے کا آغاز کیا ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مدظلہ العالی کے نام عرب ممالک اور دوسرے ملکوں سے ایسے خطوط اور اطلاعات موصول ہو رہی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنگالی قوم پرست جو پاکستان سے باہر رہتے ہیں برابر مغربی پاکستان کے خلاف پروپگنڈا کر رہے ہیں اور یہ بات پھیلا رہے ہیں کہ مغربی پاکستان کی فوج بنگالی مسلمانوں کا خون بہا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے سفارت خانے انہیں خاص طور پر غذا فراہم کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ سارا مخالفانہ پروپگنڈا ہندوستانی سفارت خانوں کی منصوبہ بندی اور نگرانی کے تحت ہو رہا ہے۔ اس پروپگنڈے کے جواب میں مولانا مودودی نے ذیل کا میمورنڈم دنیا کے تمام مسلمانوں کو بھیجا ہے تاکہ اس زہریلے پروپگنڈے کا بروقت سدباب کیا جا سکے اور غیر ممالک میں رہنے والے پاکستانی اور دوسرے مسلمان صحیح صورتِ معاملہ سے آگاہ ہو جائیں۔

خ - ح]

۱۔ سب سے پہلے یہ بات جان لینی چاہیے کہ مشرقی پاکستان کی عام مسلمان آبادی نہ کبھی پہلے علیحدگی کی خواہشمند تھی اور نہ اس نے علیحدگی کے لیے شیخ مجیب الرحمٰن کو ووٹ دیئے اور نہ اس بغاوت میں جو یکم مارچ ۱۹۷۱ء سے شروع ہوئی عام مسلمان شریک تھے۔ دراصل یہ علیحدگی کی تحریک مسلمانوں کے ایک مخصوص بنگالی قوم پرست عنصر کی طرف سے اٹھی تھی جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کا تعلیم یافتہ ہے، جس کو اسلام کی کوئی تعلیم نہیں ملی، جو زیادہ تر ہندو پروفیسروں کا شاگرد ہے جن نے ہندوؤں کے لکھے ہوئے بنگلہ لٹریچر سے تاثر قبول کیا ہے اور جس کے اندر الحاد، اسلام سے کھلے کھلے انحراف اور اخلاقی بے قیدیوں کی بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے